عامر سہیل

اردو میں تدوین کا معلمِ اوّل ـــــ حافظ محمود شیرانی

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی چھان بین، اصلیت، تفتیش اور یقین کے ہیں۔ علم کے بہت سے شعبوں میں یہ لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ادب میں تحقیق سے مراد حقائق کی بازیافت ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی نامعلوم شے کو معلوم کر کے، معلوم کی نئی تشریح کرنا اور پھر مستند نتائج کا استنباط کرنا، تحقیق کے اولین مقاصد میں شامل ہے۔ ہر علم کی طرح اس علم کے بھی اپنے اصول وضوابط ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہی منزل مقصود تک پہنچا جاسکتا ہے۔ محققین کو اس راہ میں ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ایک مستقل مزاج محقق ان مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اردو زبان وادب کے بلند پایہ محقق رشید حسن خان ادبی تحقیق کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

”تحقیق کا حال کلاسیکی موسیقی جیسا ہوتا ہے، جس میں عجلت، آسان پسندی، بوالہوسی اور خفیف الحرکاتی کو مطلق دخل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت ریاضت کرنا پڑتی ہے اور اس ریاضت کی نہ مدت مقرر ہوتی ہے اور نہ معاوضہ طے شدہ ہوتا ہے۔“(۱)

تحقیق اور تنقید باہم مل کر ادب کی نشوونما کرتے ہیں۔ ہر اچھا محقق ایک نقاد بھی ہوتا ہے۔ مظفر علی سید رقم طراز ہیں، ”ہر محقق میں ایک جزوی نقاد اور ہر نقاد میں ایک جزوی محقق لازم ہے۔“(۲)

سید صاحب کی رائے کافی حد تک درست ہے۔ لیکن اردو ادب میں ایسے محققین کی کمی نہیں، جنہوں نے اپنی تحقیق میں تنقیدی عنصر کو جزوی استعمال کے بجائے بنیادی حیثیت کے

طور پر برتا ہے، مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر اسلم قریشی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور وغیرہم کی تصانیف میں تنقید اور تحقیق باہم پیوست ہیں۔ اس تحریر میں حافظ محمود شیرانی کے کچھ معروف مقالات پر تفصیلی بحث کی جائے گی تا کہ تحقیق اور تنقید کے ضمن میں ان کی خدمات سے روشنی حاصل کی جا سکے۔

حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۰۔۱۹۴۶) نے تقریباً بیسویں صدی کے آغاز سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ اُن کی وفات تک برابر جاری رہا۔ اُن کے یہ تمام مضامین و مقالات مختلف ادبی اور تحقیق جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد نبیرہ شیرانی ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ۱۹۶۶ء سے ان مقالات کو ترتیب دینے کا کام شروع کیا اور اب تک (مجلس ترقی ادب کے تعاون سے) مقالات کی نو جلدیں منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کام شاید دس جلدوں میں مکمل ہوگا۔

حافظ محمود شیرانی اردو اور فارسی کلاسیکی ادبیات کے بے مثل محقق اور نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں، یوں تو ان سے پہلے بھی ان زبانوں میں تحقیق اور تنقید پر خاصا کام ہو چکا تھا، لیکن شیرانی نے اپنے تحقیقی اجتہاد کی بدولت اس سرمائے کا ازسرنو جائزہ لیا اور پہلی بار گزشتہ روایات سے اختلاف کرتے ہوئے بہت سی کلاسیکی کتب کا اصل مقام و مرتبہ متعین کیا، انہی وجوہات کی بنا پر رشید حسن خان، حافظ شیرانی کو اردو ادب میں تحقیق و تدوین کا معلم اول قرار دیتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کا طریق تحقیق دوسرے محققین سے خاصا مختلف تھا۔ وہ ایک ماہر سائنسدان کی طرح معروضی انداز نظر اختیار کرتے ہوئے نتائج اخذ کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالات کے ذریعے ہمیں یہ گر سکھایا کہ کتاب یا صاحب کتاب کے بارے میں اصل معلومات خود کتاب کے اندر موجود ہوتی ہے، یعنی کتاب کے داخلی شواہد ہی تحقیق کے لیے بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ وہ تمام عمر خود اسی اصول کے تحت کام کرتے رہے۔ ادب کے مورخ، نقاد اور محقق ہونے کے علاوہ وہ علم تاریخ، عتیقیات، علم خط، مسکوکات، علم عروض اور اسالیب ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مخطوطات کی تلاش و جستجو میں گزرا، مخطوطات کی جانچ پرکھ میں اُن کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ محض مخطوطے کے کاغذ اور سیاہی کو دیکھ کر ہی اس کے زمانے کا تعین کر لیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے وہ مقالات بڑے وقیع ہیں جو آبِ حیات، محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوق، خالق باری، پنجاب میں اردو، تنقید شعرالعجم، پرتھوی راج راسا، باغ و بہار، مثنوی یوسف زلیخا، سب رس، مثنوی لیلیٰ مجنوں، دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، خزائین الفتوح، مثنوی عروۃ الوثقیٰ از شہابی اور شاہ نامہ فردوسی وغیرہم پر لکھے گئے ہیں۔ شیرانی کے یہ تمام مقالات ان کے تاریخی شعور، فن تحقیق، تصحیح متن، اسلوب تنقید اور منطقی طریق استدلال کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، حافظ شیرانی کے طریقِ کار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شیرانی مرحوم نے اپنی تحقیقی کاوشوں میں ''شک'' سے روشنی و رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور بہ ظاہر ایک منفی رویے سے اپنی ذہنی سفر کا آغاز کر کے مثبت نتائج تک پہنچے اور اپنی جستجوئے حقائق کو اُس منزل تک پہنچایا جہاں تک معروضی طریق رسائی نے ان کا ساتھ دیا اور جہاں یہ وسائل ختم ہو گئے وہاں ان کا قلم بھی رک گیا۔''(۳)

حافظ محمود شیرانی کے تمام مقالات کا تجزیہ کرنے کے لیے تو ہزارہا صفحات درکار ہوں گے لہٰذا یہاں ان کے چند معروف مقالات آب حیات، دیوان ذوق پر آزاد کے اضافے اور اصلاحات، باغ و بہار کا تحقیقی مطالعہ، خالق باری، پنجاب میں اردو اور تنقید شعرالعجم کو زیر بحث لایا جائے گا۔

محمد حسین آزاد کی شہرۂ آفاق تصنیف ''آب حیات'' کو اردو کے کلاسیکی ادب میں آج بھی اپنی تمام تر تاریخی غلطیوں کے باوجود ایک بلند اور منفرد مقام حاصل ہے۔ آزاد نے بڑی محنت اور کاوش کے بعد یہ تذکرہ مرتب کیا، لیکن اس کے ماخذ کے بارے میں چونکہ انہوں نے کوئی وضاحت نہیں کی تھی لہٰذا ایک طویل مدت تک عام لوگوں کا یہی تاثر تھا کہ ''آب حیات'' کے تمام

تر بیانات آزاد کی ذاتی تحقیقات کا ثمرہ ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے پہلی مرتبہ اس کتاب کے ماخذ اور تاریخی فروگزاشتوں پر گرفت کی اور بتایا کہ آزاد نے میر قدرت اللہ خان قاسم کی تالیف ’’مجموعہ نغز‘‘ سے بھرپور استفادہ کیا ہے نیز فاضل محقق نے ’’آبِ حیات‘‘ کے ان تمام مقامات کی نشان دہی بھی کر دی جو آزاد نے ’’مجموعۂ نغز‘‘ سے بغیر حوالہ دیے براہِ راست نقل کیے تھے۔ شیرانی مرحوم نے ’’آبِ حیات‘‘ پر اپنی تحقیق کا آغاز آغا محمد باقر (نبیرہ آزاد) کی درخواست پر کیا تھا لیکن جب آغا صاحب نے اسے پڑھ کر ناخوشی کا اظہار کیا تو انہوں نے اس علمی کام کو ادھورا چھوڑ دیا اور اس نامکمل کام کی صرف تین اقساط ہی اورینٹل کالج میگزین کے اگست ۱۹۴۱ء نومبر ۱۹۴۱ء اور فروری ۱۹۴۱ء کے شماروں میں اشاعت پذیر ہو سکیں۔ شیرانی کو آزاد سے بڑی عقیدت تھی۔ اس عقیدت کی حدیں ان کے بچپن کے اس یادگار زمانے سے جا ملتی ہیں جب انہوں نے آزاد کی تالیفات اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب سے درسی ضرورت کے تحت اکتسابِ فیض کیا تھا۔ ’’آبِ حیات‘‘ پر تنقید کرنے سے قبل وہ بڑی انکساری سے یہ اعتراف کرتے ہیں:

> ’’راقم آبِ حیات کے تنقید نگاروں میں بادلِ ناخواستہ شامل ہوا ہے۔‘‘(۴)

اس عظیم محقق کی اعلیٰ ظرفی کی ایک اور مثال دیکھیے کہ ’’آبِ حیات‘‘ پر اتنی کڑی تنقید کرنے کے باوجود اپنے مقالے کی ابتدا میں اس کتاب کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

> ’’اردو نثر میں دو کتابیں ایسی ہیں کہ جب تک اردو زبان قائم ہے ان کو
> حیاتِ جاوید حاصل رہے گی...... پہلی کا نام ’باغ و بہار‘ ہے جو میر امن
> کی تصنیف ہے دوسری کا نام ’’آبِ حیات‘‘ ہے جو شمس العلماء
> مولانا محمد حسین آزاد کی یادگار ہے۔‘‘(۵)

حافظ شیرانی نے تحقیق و تنقید کی روشنی میں ’’آبِ حیات‘‘ پر جو اعتراضات کیے اُن کی تفصیل کچھ یوں ہے (۱) آزاد کی تاریخی فروگزاشتوں پر گرفت (۲) پرتھوی راج راسا پر آزاد کے بیان کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے (۳) لفظ ’’اردو‘‘ کے قدیم استعمال پر آزاد کی تحقیق کو تسلیم نہیں کیا (۴) آزاد نے امیر خسرو کی طرف جس غزل کا انتساب کیا ہے، شیرانی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ غزل جس وزن میں لکھی گئی ہے وہ وزن امیر خسرو کے عہد میں یا اس سے قبل رائج ہی نہ تھا (۵) علمِ عروض سے متعلق آزاد نے جو تاریخی شواہد پیش کیے انہیں جدید تحقیق کی روشنی میں رد کر دیا (۶) لفظ ’’ریختہ‘‘ پر آزاد کے بیان کو کافی نہیں سمجھتے اور صاف صاف لکھ دیا ہے۔ ’’ریختہ کی وجہ تسمیہ جو مولانا نے دی ہے ہمارے دل کو نہیں لگتی۔، (جلد سوم ص ۵۴) (۷) کچھ لفظوں کے اصل ماخذ پر تحقیقی انداز سے روشنی ڈالی ہے (۸) ’’خالق باری‘‘ کے موضوع پر آزاد سے گہرا اختلاف (۹) بڑھیا ساقن اور امیر خسرو والے واقعے کی تردید (۱۰) ولی کے نام پر آزاد نے جو تاویلات پیش کی ہیں انہیں ناقابلِ اعتبار ٹھہرایا ہے۔ (۱۱) آزاد نے جو حوالہ جات دوسرے ذرائع سے حاصل کیے تھے شیرانی نے ناقابلِ تردید دلائل کی بنیاد پر ان کے اصل ماخذ کی نشان دہی کی (۱۲) میر قدرت اللہ قاسم کے ’’مجموعہ نغز‘‘ کے ان بیانات کو بھی سامنے لائے ہیں جو آزاد نے بغیر حوالوں کے ’’آبِ حیات‘‘ میں درج کر دیے تھے۔ (۱۳) اشرف علی خان افغان کے باب میں آزاد کے کمزور بیانات پر گرفت کی ہے۔ (۱۴) مرزا مظہر جانِ جاں پر آزاد نے جو کچھ لکھا اس پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد بے بنیاد قرار دیا اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے۔ ’’حضرت مولانا نے تمام تذکروں اور تاریخوں کو پسِ پشت ڈال کر چند بے سروپا اور بے سند باتوں کو لے کر اور نمک مرچ لگا کر آبِ حیات کو نقلِ محض بنا دیا ہے۔‘‘ (جلد سوم ص ۷۷)

’’آبِ حیات‘‘ پر حافظ شیرانی کے علاوہ دیگر بہت سے قابلِ قدر اصحاب نے قلم اٹھایا ہے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد صادق، سید مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر اسلم فرخی اور حبیب الرحمٰن خان شیروانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لیکن بلا مبالغہ شیرانی کی تحقیق و تنقید کا پایہ ان محققین سے بہت بلند ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے مقالے آبِ حیات کی حمایت میں’’ شیرانی کے کچھ نکات پر اختلاف کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن یہ نکات اُن کی تحقیقات پر کوئی نیا اضافہ نہیں کر سکے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ آزاد کے بارے میں ان کے جذبۂ حمایت کو کچھ تقویت ملی ہو۔ سید مسعود حسن رضوی کا معاملہ دوسرے محققین سے ذرا مختلف بھی

ہے اور دلچسپ بھی۔ جناب رضوی آزاد کی کوئی فروگزاشت ماننے کو تیار نہیں ہیں، بہ قول ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی۔

''سید مسعود حسن رضوی وہ واحد شخص ہیں جن کے نزدیک ''آبِ حیات'' میں درج کردہ آزاد کی ہر بات مستند ہے اور تحقیق کے اعلیٰ ترین معیاروں پر پوری اترتی ہے۔''(۶)

''آبِ حیات'' کی تردید اور حمایت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ابھی تک کسی اور محقق نے شیرانی کی تحقیق پر کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا۔ ''آبِ حیات'' پر ان کے تمام فیصلے آج بھی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

محمد حسین آزاد کا اردو ادب میں ایک یادگار کارنامہ دیوانِ ذوق کی ترتیب اور اشاعت ہے لیکن صد افسوس! کہ ڈاکٹر محمد صادق اور حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات کے بعد اس دیوان کی حیثیت مشکوک ہو گئی ہے۔ اس تحقیقی مہم کی داستان کچھ یوں ہے کہ آغا محمد باقر کے توسط سے شیرانی کی رسائی کچھ ایسے ٹھوس شواہد تک ہوئی جن کی بنیاد پر یہ فیصلہ دینا مشکل نہ رہا کہ آزاد نے دیوانِ ذوق میں نہ صرف بہت سے شعروں کی اصلاح کی، بلکہ اچھی خاصی تعداد میں خود ساختہ کلام بھی دیوان میں شامل کر دیا ہے۔ آزاد نے اس کے بارے میں یہ طرفہ جواز پیش کیا کہ یہ تمام کلام استاد ذوق کے بچپن کا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے ناقابلِ تردید دستاویزی ثبوت کی روشنی میں اس ادبی بد دیانتی کا راز افشا کیا۔ شیرانی کو آغا صاحب سے جو کاغذات ملے ہیں ان پر مولانا آزاد نے استاد ذوق کی بہت سی غزلوں کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، لکھنے کا انداز یہ ہے کہ انہوں نے بار بار کی کاٹ چھانٹ کے بعد ایک ایک شعر موزوں کیا ہوا ہے۔ ان قلمی نسخوں پر کم و بیش وہی اشعار درج ہیں جو انہوں نے اپنے مرتب کردہ دیوانِ ذوق میں شامل کیے ہیں۔ یہ کلام نہ تو میر قدرت اللہ قاسم کے ''مجموعہ نغز'' میں ملتا ہے اور نہ حافظ ویران کے مرتب کردہ دیوان میں۔ (ذوق کے شاگرد حافظ غلام رسول ویران نے ۱۲۷۹ھ میں یعنی اپنے استاد کی وفات کے آٹھ سال بعد کلام ذوق کو مختلف رسائل، اخبارات اور بیاضوں سے اکٹھا کر کے شائع کروا دیا تھا) ان تمام حقائق کی روشنی میں شیرانی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''مولانا نے یہ غزلیں تصنیف کر کے ذوق کے دیوان میں اضافہ کر دیا ہے اور استاد کے بچپن کے کلام سے انہیں موسوم کر دیا ہے۔''(۷)

شیرانی کے علاوہ دوسرے ناقدینِ ادب نے بھی آزاد کی اصلاحوں اور اضافوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ حامد حسن قادری ''داستانِ تاریخ اردو'' میں اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ آزاد نے ذوق کے کلام میں تصرف کیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دیوان ذوق کے مقدمے میں آزاد کی اصلاحوں کو ان کے ''اختلالِ ذہنی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ان اصلاحات کے مضمرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''ویران اور آزاد دونوں کے متن اشعار سے یہ بات فوراً واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کے ہاں جو تبدیلی ہے اس کی وجہ سے ذوق کے اکثر اشعار سست ہو گئے ہیں۔ وہ روانی اور برجستگی جو ذوق کے کلام کی خصوصیت ہے ان اشعار میں نہیں ملتی۔''(۸)

حافظ شیرانی نے اپنے گراں قدر مقالے ''دیوان ذوق پر آزاد کی اصلاحات'' میں انہوں ایسی مثالیں نقل کی ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آزاد نے اپنا حقِ شاگردی کس کس طرح سے ادا کیا ہے۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس مقابل میں شیرانی نے اپنے استدلال کی بنیاد حافظ ویران کے مرتبہ دیوان پر رکھی ہے۔

(۱) کیا خط میں مدعا لکھوں اپنا کہ مدعی (متن ویران)
پہلے ہی ان کو میری طرف سے پڑھا چکے
(۲) کیا خط لکھوں انہیں کہ جو لکھنے کی بات ہے (متن آزاد)
پہلے ہی غیرواں ہیں انہیں سب پڑھا چکے
(۳) آنا بلا سے اس کا قیامت سے کم نہیں (متن ویران)
مرتے ہیں انتظار میں، اک روز آ چکے
(۴) آنا بلا سے ان کا قیامت سے کم نہیں (متن آزاد)
ہیں ہم تو مر چکے اسے آنا ہو آ چکے

حافظ محمود شیرانی اپنے مقالے میں صرف آزاد کی اصلاحوں کو ہی سامنے نہیں لائے بلکہ شعروادب کی لطافتوں کوملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ایک باذوق سخن فہم کی حیثیت سے ان اصلاحات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ اس انتقاد میں لفظ اور معنی کی جن باریکیوں کو اجاگر کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ شیرانی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا اسی لیے وہ شعری ادب کی فنی نزاکتوں سے خوب واقف تھے۔ آزاد کی اصلاحات پر اُن کی تنقید اس بات کی غماز ہے کہ وہ علم بیان اور علم بدیع کی گہرائیوں اور لطافتوں پر کامل دسترس رکھتے تھے۔

اردو ادب میں رواں، سادہ اور سہل اسلوب نگارش کو پہلے پہل میر امن کی ''باغ و بہار'' کے ذریعے متعارف کرایا گیا ہے بعد میں اس روایت کو غالب اور سرسید احمد خان کے رفقاء نے مزید ترقی دی اور اس اسلوب کو عربی و فارسی کے تکلفات سے آزاد کرا کے خالص اردو کے مزاج میں ڈھال دیا۔ ''باغ و بہار'' زبان و بیان کی جدتوں کے علاوہ اپنے قصے کی وجہ سے بھی خاصی اہم ہے۔ اس میں دوسری داستانوں کی نسبت فوق الفطرت عناصر کا ایک خاص توازن ملتا ہے اور اکثر واقعات زندگی کی عام فطری سطح سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ دہلی کی تہذیب و ثقافت کی جتنی عمدہ اور جاندار تصویر اس داستان کے ذریعے سامنے آتی ہے اس کی مثال کہیں اور تلاش کرنا قدرے مشکل ہے۔ ''باغ بہار'' کا قصہ بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن اس قصے کے ماخذ کے بارے میں محققین کی آراء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے نوبت بہ ایں جا رسید کہ خود میر امن نے اس کے ماخذ سے متعلق امیر خسرو اور نظام الدین اولیاء کے جو حوالے پیش کیے ہیں وہ بھی بہت سے محققین کے نزدیک قابل قبول نہیں رہے۔ اس نزاعی موضوع پر ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے اپنے طور پر کچھ نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے میر امن پر یہ الزام لگایا تھا۔

''فارسی اور نوطرز مرصع کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''باغ بہار'' فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ ''نوطرز مرصع'' ہے تعجب اس بات کا ہے کہ میر امن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کا تو ذکر کیا مگر نوطرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے۔''(۹)

شیرانی نے مولوی عبدالحق کے اس بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ میر امن نے جب پہلی بار اپنی کتاب شائع کی تو اس کے سرورق پر یہ عبارت درج تھی۔

''باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دہلی والے کا، ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خان کا ہے فارسی قصہ چہار درویش سے۔''(۱۰)

شیرانی کے بہ قول پہلی اشاعت پر تو یہ عبارت درج تھی لیکن بعد میں جب ''باغ و بہار'' کو طباعت سے آراستہ کیا گیا تو سرورق کی عبارت کو حذف کر دیا گیا، جس کے باعث محققین میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ میر امن نے جان بوجھ کر ''نوطرز مرصع'' کا ذکر نہیں کیا۔ جناب شیرانی نے اپنی تحقیق میں ان تمام مصنفین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے فارسی زبان میں اس قصے کو لکھا تھا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے صرف حکیم محمد علی اور انجب کا ذکر مختلف تذکروں کے ذریعے پہنچ سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ قصہ چہار درویش کے ایک فارسی نسخے میں ہی اس قصے کو امیر خسرو کی تالیف بتایا گیا تھا، بعد ازاں میر امن نے بھی انہی روایات کو سچ سمجھ کر قبول کر لیا۔ لیکن شیرانی نے ''باغ و بہار'' کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر بڑے اعتماد سے یہ رائے قائم کی کہ اس داستان کا امیر خسرو کے عہد سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ امیر اپنی تحریروں میں مقفّٰی و مسجع اسلوب کے ساتھ ساتھ دقت پسندی اور مشکل پیرایۂ اظہار کا خاص اہتمام کرتے تھے، جب کہ یہ فارسی قصہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھا ہوا ہے۔ دوسری اہم دلیل کے مطابق ان کی تصانیف اور ملفوظات و واقعات پر جو تحقیقی کام ہوا ہے اس میں قصہ ٔچہار درویش اور اس کے سبب تالیف کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ قصے میں جن شعراء کے اشعار پیش کیے گئے، ان کا تعلق بھی خسرو کے بعد والے زمانے سے ہے۔ ایک اور قابلِ غور پہلو پر شیرانی نے توجہ دلائی کہ قصے کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا شیعہ عقائد سے تعلق رکھتا ہے جب کہ امیر خسرو پکے سنی تھے۔ شیرانی نے ان الفاظ و تراکیب پر بھی مدلل بحث کی جو عہد خسرو میں مروج نہیں تھے۔ ان تمام داخلی شواہد کی روشنی میں وہ یہ نتائج اخذ کرتے ہیں کہ درحقیقت یہ قصہ محمد شاہ کے عہد میں تحریر کیا گیا تھا۔ ''باغ و بہار'' پر حافظ شیرانی کی یہ تحقیق بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اسی

کی بدولت ہمیں اصل قصے کے ماخذ کا پتا چلتا ہے۔

حافظ محمود شیرانی کے بعد اس داستان پر تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک بلند پایہ محقق رشید حسن خان نے ’’باغ و بہار‘‘ کو چند نایاب نسخوں کی مدد سے ازسرِ نو مرتب کیا ہے اور اپنے مقدمے میں ان کم یاب نسخوں کا تعارف بھی کرایا ہے جن تک شیرانی اور مولوی عبدالحق کی رسائی نہ ہو سکی، کیونکہ ان کے زمانے میں تحقیق کے ذرائع زیادہ وسیع نہ تھے اور محققین کو مخطوطات تک پہنچنے کے لیے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ آج تو پاکستان، ہندوستان اور دیگر مغربی ممالک کے بیشتر مخطوطات کی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں، اب محققین کو پہلے ہی سے علم ہو جاتا ہے کہ ان کے مطلب کا مواد کہاں کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ رشید حسن خان نے بھی ان جدید وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ’’باغ و بہار‘‘، ’’فسانہ عجائب‘‘ اور ’’مثنوی سحر البیان‘‘ پر کارآمد اور جاندار کام کر کے ایک بار پھر حافظ شیرانی اور مولوی عبدالحق کی تحقیقی روایات کو زندہ کر دیا ہے۔ رشید حسن خان اپنے تازہ ترین انکشافات میں یہ بتاتے ہیں کہ ’’باغ و بہار‘‘ کی نئی اور پرانی اشاعتیں کم و بیش صرف دو نسخوں کی نقل پر عمل میں آتی رہی ہیں۔ ان کے بہ قول ’’یہ سب یا تو اشاعتِ اوّل (۱۸۰۴) کی نقل ہیں یا ڈنکن فاربس کے نسخے پر مبنی ہیں۔‘‘ (۱۱) آگے چل کر انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں نسخے تدوین کے لیے قابل سند نہیں ہو سکتے۔ رشید حسن خان کے نزدیک ’’باغ و بہار‘‘ کا وہ نسخہ بڑا اہم ہے جس کے ایک سو دو صفحات پہلی بار ’’ہندی مینول‘‘ میں شائع ہوئے تھے۔ بہر حال ان کی تحقیق کا ماحصل بھی وہی کچھ ہے جس پر شیرانی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔

امیر خسرو کی شخصیت کو اردو اور فارسی ادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ فنِ شاعری، علمِ نجوم، قواعد و بلاغت، فقہ اور علمِ موسیقی کے مسائل پر گہری اور عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ موسیقی میں خیالِ ایمن، قول اور ترانہ کے راگوں کو بھی امیر ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ نے بیس برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلسلہ چشتیہ کے مسلکِ طریقت سے وابستہ ہو گئے۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق آپ نے تقریباً ننانوے (۹۹)

کتابیں تصنیف کیں، مگر ہم تک اُن کی بہت کم کتابیں پہنچ سکی ہیں، انہی کتابوں میں ایک ’’خالق باری‘‘ ہے جو ایک طویل عرصے سے امیر خسرو سے منسوب چلی آ رہی ہے، لیکن حافظ شیرانی نے اپنی تحقیق میں اس انتساب کو بڑی کامیابی سے رد کر دیا اور بتایا کہ یہ کتاب کسی طرح بھی امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اپنے مخصوص طریقِ تحقیق کے مطابق کتاب کے داخلی شواہد کو معروضی انداز میں پرکھنے کے بعد ایسے تاریخی اور منطقی دلائل کا استخراج کیا کہ اب ان کی بنیاد پر یہ کہنا مشکل نہیں رہا کہ امیر خسرو کا اس کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے اس نزاعی موضوع پر خوب تفصیل سے لکھا ہے۔ پہلے ۱۹۲۶ء کے ایک مضمون ’’خالق باری‘‘ میں اس بحث کا آغاز کیا بعد ازاں ’’پنجاب میں اردو‘‘ کے ایک باب میں اس پر کچھ مزید اضافے کیے۔ (’’خالق باری‘‘ کو حافظ صاحب نے ایڈٹ بھی کیا تھا۔ جو انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹۴۴ء میں شائع کر دی تھی) شیرانی کی اس تحقیق پر اضافہ کرنا تو ممکن نہیں لہٰذا ذیل میں انہی کے مضامین سے اخذ کردہ معلومات کو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر علم ہوتا ہے کہ اُن کا معیارِ تحقیق کس قدر بلند تھا۔ شوق و جستجو کی اسی مسلسل لگن نے اُن کی تحقیق اور تنقید کو تخلیق کے مقام پر فائز کر دیا تھا۔

’’پنجاب میں اردو‘‘ میں اس موضوع پر جو بحث چھیڑی گئی اس کے مطابق محمد امین صاحب چڑیا کوٹی اور مولوی محمد حسین آزاد نے محض اپنے اپنے تخیل کی بنیاد پر ’’خالق باری‘‘ کے بارے میں غلط معلومات کو عام کیا ہے۔ امین صاحب کا بیان ہے۔ ’’اس میں کئی اشعار تھے‘‘ آزاد نے ’’آبِ حیات‘‘ میں لکھا۔ ’’یہ کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔‘‘

حافظ شیرانی اپنے دلائل کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’خالق باری‘‘ بچوں کے تعلیمی نصاب کے لیے لکھی گئی تھی لہٰذا اسے لازماً مختصر ہونا چاہیے تھا تاکہ بچوں کو حفظ کرانے میں آسان ہو۔ دوسری اہم بات یہ منظوم کتاب چونکہ نوعمر بچوں کے لیے تھی یوں اصولاً اس کی بحروں کا شگفتہ اور رواں ہونا بھی لازم آتا ہے لیکن اس کی اکثر بحریں غیر شگفتہ اور ناہموار ہیں پھر اوزان کی ایسی فاش غلطیوں کو روا رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ’’ایک مصرع بڑھ گیا ہے اور ایک گھٹ گیا، کوئی

او چھا اور لمبا ہو گیا ہے۔"

شیرانی نے ان کے اوزان سے متعلق ایک دلچسپ بات یہ بھی لکھی ہے:

> "اگر اس کے وزن کی تلاش کی جائے تو فارسی والے کہیں گے کہ کوئی ہندی وزن ہوگا۔ اور ہندی والے کہیں گے کہ فارسی وزن ہوگا۔ (۱۲)

اس کتاب کی ایک اور بڑی خامی یہ ہے کہ لفظوں کے استعمال اور اُن کے معنوں کے بارے میں کسی اصول اور قاعدے کو سامنے نہیں رکھا گیا۔ یہ تمام غلطیاں اس نوعیت کی ہیں کہ امیر خسرو جیسے بلند پایہ عالم سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ انہی ٹھوس شواہد کی بنیاد پر حافظ شیرانی بڑی جرات کے ساتھ یہ کہتے ہیں۔ "میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔" (۱۳)

شیرانی نے ایک تاریخی دلیل یہ پیش کی ہے کہ عالمگیر کے عہد میں اردو زبان کی طرف زیادہ توجہ دی گئی تھی اور یہی زبان ذریعۂ تعلیم بھی تھی، اسی دور یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی میں "خالق باری" کے انداز پر درجنوں کتابیں ضبط تحریر میں لائی گئیں، مثلاً اللہ باری، حامد باری، ایزد باری، واحد باری اور راز باری وغیرہم...... لہٰذا ان قرائین کے مطابق "خالق باری" اسی عہد کے قریب قریب وجود میں آئی ہوگی۔ شیرانی لکھتے ہیں۔

"یہ امر قرینِ قیاس نہیں کہ خالق باری ۷۲۵ھ سے قبل لکھی جائے اور اس کے بعد پورے چار سو برس یعنی گیارھویں صدی تک اہل علم خاموش رہیں اور بارھویں اور تیرھویں صدی میں اس کی تقلید میں درجنوں کتابیں لکھی جانی شروع ہوں۔ میرے نزدیک خالق باری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس کا زمانہ ہمیں دیگر تصنیفات کے زمانے کے قریب ماننا چاہیے۔ (۱۴)

"خالق باری" پر ان کی آخری تحقیق "دیباچۂ دوم خالق باری" میں دیکھی جا سکتی ہے اس وقت تک شیرانی کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے توسط سے ایک اور قیمتی مخطوطہ دستیاب ہو چکا تھا۔ یہ مخطوطہ ۱۱۸۷ء میں لکھا گیا تھا۔ اور صاحبِ کتاب نے دیباچے میں وہ تمام ضروری معلومات فراہم کر دیں جو اس سے قبل پردۂ اخفا میں تھیں دراصل "خالق باری" سے متعلق جو مخطوطے پہلے

دستیاب ہوئے ان پر مرتبین کے نام اور دیگر کوائف درج نہ تھے جب کہ زیر بحث مخطوطے میں ہر قسم کی معلومات موجود تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں ایک تو شیرانی کے گزشتہ تحقیقی بیانات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے نیز یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خالق باری کا اصل مصنف خسرو ضیاء الدین ہے اور سال تصنیف ۱۰۳۱ھ ہے یوں یہ تاریخی مغالطہ رفع ہوا۔ امیر خسرو نے ۷۲۵ھ میں وفات پائی تھی۔ اس دریافت کے بعد حافظ شیرانی کی تحقیق بالآخر اپنی منزل پر پہنچ کر ان تمام تاریخی افسانوں کی تردید کر دیتی ہے جو صدیوں سے گمراہی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اس موضوع پر تفصیلی مطالعے کے لیے "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ہشتم کا مطالعہ قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

حافظ محمود شیرانی اپنی ہمہ گیر شخصیت کی بدولت تاریخ اور ادب کے بہت سے موضوعات پر یکساں دلچسپی سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اردو لسانیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ "پنجاب میں اردو" (۱۹۲۸ء) ان کی ایسی تصنیف ہے جس میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں نئے علمی مباحث اٹھائے گئے گو کہ اس سے قبل ۱۹۲۳ء میں نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "دکن میں اردو" منظر عام پر آ چکی تھی لیکن بہ قول ڈاکٹر سلیم اختر:

"جہاں تک نئے مباحث چھیڑنے اور لسانی نزاعات کا تعلق ہے تو محمود شیرانی کی یہ کتاب لسانی تحقیقات کے ٹھہرے پانی میں ایک بھاری پتھر ثابت ہوئی اور لسانیات کے عمل میں یہ ایسی آواز تھی جس کی بازگشت آج تک سنی جا سکتی ہے۔" (۱۵)

حافظ شیرانی نے اپنی اس کتاب میں سب سے پہلے تو محمد حسین آزاد کے اس نظریے کی تردید کی جس میں اردو کو برج سے ماخوذ بتایا گیا ہے، پھر ان دونوں زبانوں کی صرف و نحو اور دیگر قرائن کو موضوعِ بحث بنا کر بتایا کہ یہ دونوں زبانیں الگ الگ خصوصیات کی حامل ہیں مثلاً اگر صرف ان زبانوں کے اسماء و افعال کا ہی موزانہ کیا جائے تو علم ہوگا کہ اردو جہاں ان کو الف پر ختم کرتی ہے وہاں برج ان کو واؤ پر ختم کرتی ہے نیز برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے اس باہمی تقابل کے بعد حافظ شیرانی کی رائے ہے:

> ’’اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں، ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں بہنوں کا رشتہ ہے۔‘‘(۱۶)

اس نظریے کی تردید کے بعد شیرانی اپنے نظریے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں سب سے پہلے پنجاب میں اردو کی قدامت کے بارے میں وہ اپنا تاریخی استدلال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’ہم اردو کے آغاز کو شاہجہان یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔‘‘(۱۷)

حافظ شیرانی ہندوستان میں مسلمانوں کی توطن گزینی کو ہی اردو کے آغاز کی بنیاد مانتے ہیں۔ اپنے نظریے کی مزید تائید کے لیے وہ پنجاب میں فارسی بولنے والے مسلمانوں اور پنجابی بولنے والے ہندوؤں کے روابط کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحقیق کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے یہ روابط تقریباً ڈیڑھ صدی تک قائم رہے۔ اس دوران بعض صوفیاء کرام کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے پنجابی اور فارسی کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے کثیر مواقع ملتے رہے، بعدازاں یہی روابط اردو کی تخلیق کا باعث بنے۔ شیرانی انہی تاریخ حقائق کی بنیاد پر یہ موقف اختیار کرتے ہیں اردو کا اصل مولد پنجاب ہے ان کا کہنا ہے:

> ’’پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں قریب ترین مماثلت موجود ہے ان کی صرف ونحو اہم قواعد و مسائل میں باہم مطابقت رکھتی ہے اور ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ ان میں مشترک ہیں۔‘‘(۱۸)

حافظ شیرانی نے اپنے نظریے کی وضاحت اور صراحت کے لیے تاریخ سے مدد لینے کے علاوہ صوفیا کرام کے ملفوظات سے بھرپور استفادہ کیا، نیز اردو اور پنجابی کا تقابل کر کے ان کے

باہمی اتحاد کو بھی بطریق احسن ثابت کیا ہے۔ غرض پنجاب میں اردو کا نظریہ حافظ شیرانی کی تحقیق کا ایک نہایت وقیع اور شان دار کارنامہ ہے۔ اس نظریے کے ابتدائی خدوخال پنڈت کیفی اور شیر علی خان سرخوش کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں (شیرانی نے ان کی اولیت کو تسلیم کیا ہے) لیکن حافظ صاحب نے پہلی مرتبہ اسے منظم صورت میں یکجا کر کے ایک نظریے کی شکل میں پیش کیا۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں:

> ’’اردو زبان کا آغاز سرزمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ نہیں مگر شیرانی نے اس نتیجے کا صغریٰ و کبریٰ مرتب کیا ہے اور قیاسات کو حقائق کے مرتبے تک پہنچایا ہے اور اصل بحث کے علاوہ کئی ایک ضمنی مطالب پر بھی نئی روشنی ڈالی ہے۔‘‘ (مقالات تاثیر ص ۳۱۹)

پنجاب میں اردو کا نظریہ علمی حلقوں میں بہت جلد مقبول ہوا بہت سے لوگوں نے جہاں اس کی حمایت میں قلم اٹھایا، وہاں کچھ محققین اور ماہرین لسانیات نے اس نظریے سے گہرا اختلاف بھی کیا ہے ان میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سید نجیب اشرف ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی، پروفیسر احتشام حسین خان، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان میں سے کچھ ماہرین نے ’’پنجاب میں اردو‘‘ پر تنقید کرنے کے علاوہ اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء کے بارے میں نئے نظریات کی داغ بیل بھی ڈالی ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سید نجیب اشرف ندوی نے اپنے آپ کو صرف تنقید تک محدود رکھا ہے۔ ’’پنجاب میں اردو‘‘ کی مخالفت میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن حقیقت میں یہ کتاب آج بھی لسانیات پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اردو لسانیات کی کوئی بحث اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

محمد شبلی نعمانی (۱۸۵۴۔۱۹۱۴ء) دبستانِ سرسید کے اہم رکن اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک سوانح نگار، مورخ اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی تصانیف المامون، سیرۃ النعمان، علم الکلام، الکلام، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرۃ النبیؐ، شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر

وغیرہم ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ ''مقالات شبلی'' میں بھی ادب اور تاریخ سے متعلق بہت سے علمی مباحث موجود ہیں۔ شبلی کی سبھی تصانیف اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں لیکن جو عظمت اور شہرت سیرۃ النبیؐ اور شعرالعجم کے حصے میں آئی وہ ان کی دوسری کتابوں کو نصیب نہ ہو سکی۔

''شعرالعجم'' میں فارسی شعراء کے کلام کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ اور ان کے حالات وکوائف درج ہیں۔ عوام وخواص کے علمی حلقوں میں اس تصنیف کو ہمیشہ قبولِ عام حاصل رہا اور اس کی تاریخی فروگزاشتوں پر کبھی توجہ نہیں دی، ''شعرالعجم'' کے قارئین کے لیے اتنا کافی تھا کہ یہ ایک ثقہ محقق کی عالمانہ کاوش ہے اور اس میں ان کے ذوق کا تمام سامان موجود ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے پہلی مرتبہ اس سحر کو توڑا اور یہ انکشاف کیا کہ اس کتاب میں شبلی سے بہت سی تاریخی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ تاریخی روایات بغیر درایت کے شامل کر دی گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ''شعرالعجم'' کو لکھتے وقت شبلی کی نظر سے بہت سی کتابیں نہیں گزریں لیکن پھر بھی ان کتابوں کے نام استفادے کی فہرست میں شامل کر دیے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد کے بارے میں مولانا شبلی نے جو واقعہ نقل کیا وہ محلِ نظر ہے۔ اس ضمن میں شیرانی نے شمس الدین محمد بن قیس کی لغت میں درج واقعے کو بھی ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے۔ شیرانی صاحب کا کہنا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ نظم کی وہ صنفِ خاص جس کو ہم رباعی کہنے کے عادی ہیں کوئی شخصی ایجاد نہیں بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔''(۱۹)

آگے چل کر شیرانی نے رباعی کے ارتقاء پر تفصیلی بحث کی ہے، یہاں انہوں نے اپنے استدلال کی بنیاد محقق طوسی اور ابوشکور کے بیانات پر رکھی ہے۔ شیرانی کو شبلی پر بڑا اعتراض یہ تھا کہ انہوں نے قرون کے مشاہیر رجال کے حالات کو نہایت اختصار سے پیش کیا ہے اور ان کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس میں زیادہ تر سطحی معلومات سے کام لیا گیا ہے بلکہ رودکی کے بارے میں تو تقریباً تمام تحقیق محض افسانہ تراشی پر مبنی ہے۔ حافظ شیرانی نے صاف صاف لکھ دیا:

> ''شعرالعجم میں رودکی کا افسانہ ایک دل فریب اور دل کش سراب کے منظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔''(۲۰)

شبلی نے رودکی کے بارے میں لکھا کہ وہ بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا۔ تحقیقی اعتبار سے یہ بات درست نہیں کیونکہ رودکی آخر عمر میں اس وقت اندھا ہوا تھا جب اس کی آنکھوں میں سلائی پھروادی گئی تھی۔ (ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنے تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر سعید نفیسی مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے پاس بھی اس بات کے وزنی دلائل موجود تھے کہ رودکی کو آخر عمر میں نابینا کیا گیا تھا) ''شعرالعجم'' میں رودکی سے بعض ایسے اشعار منسوب کر دیے گئے ہیں جن کا رودکی سے کوئی تعلق نہیں۔ حافظ شیرانی نے اس پر گرفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان اشعار میں جو تراکیب برتی گئی ہیں وہ رودکی کے عہد میں قطعاً مستعمل نہ تھیں۔ شیرانی اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ شبلی نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام نہیں لیا، اگر وہ ایسا کر لیتے تو بہت سی غلطیوں سے بچ جاتے۔ شبلی نے رودکی کے اشعار کے بارے میں زیادہ تر تذکروں پر اعتماد کیا تھا جب کہ شیرانی کے نزدیک رودکی کا اصل کلام تذکروں میں نہیں بلکہ لغات اسدی، تاریخ ابوفضل بیہقی، لباب الالباب از محمد عوفی اور فرہنگ جہانگیری ورشیدی وغیرہم میں ملتا ہے۔

شبلی نے رودکی کی تاریخ وفات ۳۰۴ھ بتائی ہے۔ شیرانی نے تاریخ شواہد کی روشنی میں ثابت کیا کہ اصل تاریخ وفات ۳۲۹ھ ہے، پروفیسر سعید نفیسی بھی اسی تاریخ کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ حافظ شیرانی، شبلی کے اس رویے پر بڑے حیران تھے کہ وہ علم تاریخ کے جید عالم ہونے کے باوجود واقعات کے تعین کے لیے سنین سے اوّل تو بہت کم کام لیتے ہیں اور اگر کبھی سن لکھ بھی دیں تو اس کی تاریخی حیثیت کم وبیش مشکوک ہی رہتی ہے۔ شبلی نے ''شعرالعجم'' میں کچھ ایسے دعوے کیے جو بے وزن ہیں مثلاً ان کا یہ کہنا کہ رودکی فارسی زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے درست نہیں۔ شیرانی اس دعوے پر ٹھوس بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ رودکی کے عہد میں شعروشاعری نے خاصی ترقی کر لی تھی اور اس سے پہلے بھی بہت سے لوگ صنف شاعری میں اپنی تخلیقات مرتب کر چکے تھے۔ شبلی نعمانی نے بے شمار شعراء کی تاریخ پیدائش

اور تاریخ وفات کو ناکافی تحقیق کی وجہ سے غلط لکھ دیا تھا۔ شیرانی نے ان تمام سنین کی ممکنہ حد تک تصحیح کی ہے۔ شبلی بذات خود ایک بلند پایہ محقق تھے لیکن سنین کے اندراج میں ان کی محققانہ جستجو سند کا درجہ حاصل نہ کر سکی۔ نظامی گنجوی کا سنِ وفات بہ قول شبلی کے ۵۹۶ھ ہے، شیرانی نے ناقابلِ تردید دلائل سے یہ ثابت کیا کہ نظامی ۶۰۷ھ کے بعد بھی زندہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ شیرانی، مورخین کے ایک اجتماعی نقص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''ہمارے ہاں مورخین میں ایک اور دستور رہا ہے کہ تاریخِ وفات کی غیر حاضری میں مصنفین کی آخری تصنیف کی تاریخ کو ان کی تاریخ وفات مان لیا جاتا ہے چنانچہ حکیم سنائی عنصر المعالی کیکاؤس وغیرہ کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا ہے۔''(۲۱)

شبلی نے ''شعر العجم'' میں کچھ ایسے واقعات نقل کیے جن کے بارے میں ان کے پاس کوئی تاریخِ شہادت موجود نہیں تھی، شیرانی نے اس نوع کے واقعات کا بڑی عمدگی اور غیر جانب داری سے تجزیہ کیا ہے۔ ان تجزیات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماخذ کی تلاش میں ان کی رسائی شبلی کے مقابلے بدرجہ بہتر تھی۔ شبلی تاریخ کے بے بدل عالم ہونے کے باوجود تاریخی واقعات کا تجزیہ نہیں کرتے تھے۔ جس کے باعث ان کی تاریخ نگاری تشنگی کا گہرا تاثر دیتی ہے۔ نتیجتاً تاریخی واقعات کی صحت مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔ شبلی شاعری کو ذوقی و وجدانی چیز سمجھتے ہیں۔ ''شعر العجم'' کا قاری دوران مطالعہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی انہوں نے تحقیقی ذرائع کے ہمراہ اپنے ذوق اور وجدان پر کافی بھروسا کیا ہے۔ بہ خوف طوالت صرف ان کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جن پر شیرانی نے گرفت کی، مثلاً غلط تاریخی معلومات، اسماء الرجال کی غلطیاں، ناقدانہ آراء میں توازن کا فقدان، محققانہ اجتہاد کی کمی، ایک واقعہ دو موقعوں پر چسپاں کر دینا، اصل تصنیف دیکھے بغیر رائے قائم کر لینا۔ تضاد بیانی، تحقیقِ متن سے عدم دلچسپی، خوشہ چینی کا اعتراف نہ کرنا، غلط ترجمہ یا مفہوم اخذ کرنا اور دوسروں کی تحقیقی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لینا وغیرہم۔ حافظ محمود شیرانی کے بعد ایران کے کچھ محققین نے ''شعر العجم'' کو تحقیقی زاویوں سے پرکھنے کی کاوش کی ہے۔ یہ نئی تحقیقات بھی شیرانی کی مزید

تائید وتوثیق کرتی ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کا تحقیقی کام بہت زیادہ ہے اور اس مختصر سے مقالے میں ان کی تمام علمی خدمات کا احصاء کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ انہوں نے تحقیق و تدوین کے میدان میں جو علمی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں ان کی بنیاد پر وہ بلاشرکت غیرے اردو ادب میں تحقیق و تدوین کے معلم اول تسلیم کیے گئے۔ احمد ندیم قاسمی اس نابغہ روزگار کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> ''میں حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کو علم و فن کا معجزہ قرار دیتا ہوں۔''(۲۲)

اردو اور فارسی ادبیات میں شیرانی کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

حوالہ جات:

۱۔ ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ از رشید حسن خان ص نمبر ۷۰، ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ طبع (۱۹۷۸ء)
۲۔ تحقیق اور اصول وضع اصلاحات پر مقالات، مرتبہ اعجاز راہی، ص نمبر ۱۷۵ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، اشاعت (۱۹۸۶ء)
۳۔ شیرانی مرحوم اور اردو ادب میں روایتِ تحقیق کی تشکیل جدید از ڈاکٹر تنویر احمد علوی ص نمبر ۱۵ شیرانی سیمینار (مجموعہ مقالات) بہار اردو اکادمی (پٹنہ)
۴۔ مقالات حافظ محمود شیرانی (جلد سوم) مرتبہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ص نمبر ۴۲۔ مجلس ترقی ادب (۱۹۶۶ء)
۵۔ مقالات۔ (جلد سوم) ص نمبر ۲۷۔ مجلس ترقی ادب
۶۔ حافظ محمود شیرانی، ان کی علمی و ادبی خدمات (جلد اول) از ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ص نمبر ۴۱۶ طبع اول جون (۱۹۹۳ء)۔ مجلس ترقی ادب لاہور
۷۔ مقالات۔ جلد سوم ص نمبر ۲۶۴۔ مجلس ترقی ادب لاہور
۸۔ محمد حسین آزاد۔ جلد دوم از ڈاکٹر اسلم فرخی ص نمبر ۵۲۶ اشاعت (۱۹۶۵ء)
۹۔ رسالہ اردو۔ جلد دہم۔ ص نمبر ۳۹۵ (۱۹۳۱ء)
۱۰۔ مقالات شیرانی۔ ص نمبر ۲۷۔ سلسلہ مطبوعات نمبر (۵۹) طبع ثانی۔ کتاب منزل لاہور

۱۱۔ باغ و بہار۔ مرتبہ رشید حسن خان۔ ص نمبر (۷۴۔۷۵) پاکستانی ایڈیشن
۱۲۔ پنجاب میں اردو۔ از حافظ محمود شیرانی۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ص نمبر ۱۵۵ اشاعت (۱۹۷۲ء)
۱۳۔ پنجاب میں اردو۔ ص نمبر ۱۵۴
۱۴۔ پنجاب میں اردو، ص نمبر ۱۵۳
۱۵۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، از ڈاکٹر سلیم اختر ص نمبر ۴۶۔ (۱۹۸۹ء)
۱۶۔ پنجاب میں اردو، ص نمبر ۱۶
۱۷۔ پنجاب میں اردو، ص نمبر ۱۵
۱۸۔ پنجاب میں اردو، ص نمبر (۲۴۶۔۲۴۷)
۱۹۔ تنقید شعر العجم، جلد پنجم ص نمبر ۱۰۔ طبع اول (۱۹۷۰ء)
۲۰۔ مقالات جلد پنجم، ص نمبر ۱۶۔ مجلس ترقی ادب
۲۱۔ مقالات جلد پنجم، ص نمبر ۳۷۱۔ مجلس ترقی ادب
۲۲۔ حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات (جلد اول) از ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ص نمبر ۱۶، طبع اول، جون (۱۹۹۳ء) مجلس ترقی ادب لاہور

☆☆☆